سوال نمبر

سوال نمبر

سوال نمبر

سوال نمبر

سوال نمبر

ANS 01

''حالی اپنے پیش روؤں اور معاصروں سے الگ ہیں کہ انھوں نے غزل کے موضوعات کی سابقہ حدبندی توڑ ڈالی اور سماجی اور قومی خیالات کو غزل میں داخل کیا۔ اس کے علاوہ مسلسل گوئی کے ذریعے غزل اور نظم کے مابین فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کی اور اس طرح اکبر، چکبست اور اقبال کے لئے نمونے پیدا کئے جن پر ان تین شاعروں کی غزل کا توسیعی تصور قائم ہے۔ ''

مولانا الطاف حسین حالی نے اردو ادب کو کئی حیثیتوں سے متاثر کیا۔ وہ اردو ادب کی تاریخ میں پہلے ادیب ہیں جو جتنے بڑے نثر نگار ہیں اتنے ہی بڑے شاعر بھی ہیں۔ حالی شاعری کا فطر ی ذوق رکھتے تھے اور فطری میلا ن کے تحت ہی شعر کہتے تھے۔ ان کی پرورش جس ماحول میں ہوئی وہاں شعر گوئی کی جانب مائل ہونا بھی ایک فطری امرتھابقول صالحہ عابد حسین :

''حالی قدرت کی طرف سے شاعری کا مادہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ حسن و تناسب کی پرکھ، شدت احساس،درد دل کی نعمت، تخیل کی تیزی اور مشاہدے کی گہرائی وہ خصوصیات تھیں جو فطرت نے فیاضی کے ساتھ حالی کو و دیعت کی تھیں۔ بچپن ہی سے رنج و مصائب سے دوچار ہونے کے سبب دل میں سوز وگداز پیدا ہوگیا تھا۔ جن استادوں نے ابتدائی عمر سے پڑھا یا ان میں کئی ایک بزرگ شاعری کا بڑا اچھا ذوق رکھنے والے تھے ا ور عربی و فارسی شاعری پر انھیں عبور حاصل تھا۔ حالی کے ذوق سخن کو سنوارنے میں ایک حد تک ان کا حصہ بھی ہے۔''

یہی نہیں حصول علم کے شوق میں جب حال گھر چھوڑ کر دہلی پہنچے تو وہاں غالب اور شیفتہ کی صحبتوں نے ان کے ادبی ذوق کو نکھارا ۔ چونکہ حالی میں شعر گوئی کی عمدہ صلاحیتیں موجود تھیں اس لئے غالب نے انھیں اس کام سے نہیں روکا اور ان الفاظ کے ساتھ ان کی حوصلہ افزائی کی:۔

"اگر چہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا، لیکن تمہاری نسبت سے میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔ "

حالی کی شاعری میں اس وقت ایک اہم موڑ آیا جب ۱۸۶۳ ء میں ان کی ملاقات شیفتہ سے ہوئی۔اور یوں ان کی غزل گوئی کا ذوق شیفتہ کی ادبی اور علمی صحبت میں اور بھی نکھر تا چلا گیا۔ ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

حالی لکھتے ہیں۔

"شیفتہ کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا ، تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی، جو اب تک مکر و ہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا، چمک اٹھا۔ اسی زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا مگر در حقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چند ان فائد ہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو نا پسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادھی اور سچی باتوں کو محض حُسن بیان سے دل فریب بنانا اسی کو منتہا ئے شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھور ے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔"

حالی نے "دیوان حالی" ۱۸۹۳ء میں مرتب کرکے شائع کیا۔ ۸۰ صفحات پر مشتمل اس دیوان میں غزلوں کی کل تعداد ایک سو سولہ ہے۔ ان غزلوں میں سے ۲۹ غزلیں ایسی ہیں جن پر" ق" لکھا ہوا ہے اس طرح قدیم غزیوں کی تعداد ۲۹ ہے اور جدید غزلیں ۸۷ ہیں۔ "جواہر ات حالی" جو حالی کی وفات کے بعد شائع ہوا میں صرف سات غزلیں ہیں اس طرح دیکھا جائے تو حالی کی غزلوں کی تعداد ۱۲۳ تک پہنچتی ہے۔ اگر چہ حالی کا دیوان مختصر ہے لیکن اردو غزل کا رخ بدلنے اور اس میں انقلاب برپا کرنے کی وجہ سے بہت کم دواوین اس کے ہم پلہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔

حالی کی غزل گوئی کا سلسلہ تقریباً چالیس برسوں پر محیط ہے۔ حالی کی غزل میں موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے سیاسی حالات ، اخلاقی و عمرانی تصورات ، قوم کی بربادی پر نوحہ اور قومی تعمیر نو کا جذبہ ان کی غزلوں میں نمایا ں ہے۔ حالی قدیم اسلوب کو بدستور قائم رکھتے ہوئے زبان و بیان کے اسالیب میں بتدریج اضافوں کے حامی ہیں ۔ حالی کی دورِ اول کی غزلوں میں میر، غالب ، مومن اور شیفتہ کے رنگ و آہنگ کی گونج سنائی دیتی ہے مگر

اس کے باوجود حالی کی غزلوں کا اپنا الگ مزاج اور رنگ ہے جس میں ان کی اپنی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس دور کے سیاسی و سماجی حالات بھی منعکس ہوتے ہیں۔بقول صالحہ عابد حسین:

" انھوں نے اپنے روحانی استادوں اور زندہ استادوں سے اپنی طبیعت اور صلاحیت کے مطابق استفادہ کیا تھا۔میر سے درد دل لیا،اور درد سے تصوف کی چاشنی۔غالب سے حسن تخیل، ندرت فکر اور شوخی گفتار سیکھی اورسعدی سے بیان کی سادگی اورمعنی کی گہرائی ۔شیفتہ سے" سیدھی سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانے "کا فن ۔ اور ان سب کی ترکیب سے حالی کی غزل کا ہیولیٰ تیار ہوا"

(صالحہ عابد حسین،یاد گار حالی۔ص۱۳۴)

میر کا رنگ:۔

نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت وہ ر و رو کے ملنا بلا ہوگیا

سمجھتے تھے جس غم کو ہم جانگزا وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا

روتے ہیں چار ہم پرہنستے ہیں چار ہم پر یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں

غالب کا رنگ:۔

کون ومکاں سے ہے دل وحشی کنارہ گیر اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھرکہاں

قید خردمیں رہتے آتے نہیں نظر ہم وحشت رہے گی دل کی دکھلا کے جوہراپنا

شیفتہ کا رنگ:۔

عشق سنتے ہیں جسے ہم وہ یہی ہے شاید خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

رات ان کو بات بات پہ سوسو دیئے جواب مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا۔

مومن کا رنگ:۔

دھوم تھی اپنی پارسائی کی کی بھی اور کس سے آشنائی کی

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

حالی کی غزل کے موضوعات میں تنوع اور نیا پن ہے۔ بہت سے اشعار میں روایتی مضامین کے اندر جدت پیدا کی گئی ہے۔ علامات اور تلازمات کے سلسلوں کو وسیع کیا گیا ہے۔ غزل میں پہلی بار سماجی مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ حالی نے علامتوں کے ذریعے انگریزوں کے ظلم و ستم، استحصال ، جبر و استبداد ، دیسی اور انگریزی لوگوں میں عدم مساوات اور نسلی کمتری اور برتری کا نقشہ کھینچا ہے۔ چند اشعار

درد اور درد کی ہے سب کے دوا، ایک ہی شخص یاں ہے جلاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص

قافلے گزریں وہاں کیونکے سلامت واعظ ہوجہاں راہزن و راہنما ایک ہی شخص رہے گی کس طرح راہ

ایمن کہ رہنما بن گئے ہیں رہزن خدا محافظ ہے قافلوں کا اگر یہی رہزنی رہے گی سلامتی کو وہاں قافلوں کی روبیٹھیں جہاں ہو راہزن خلق رہنما ایک ایک

بدلے ہوئے حالات ، انگریزوں کا خوف ، اقتصادی لوٹ مار ایسے دوسرے حالات حالی کے ہاں علامتوں ، اشاروں اور کنایوں میں ظاہر کیے گئے ہیں:

کھیت رستے پر ہے اور رہر و سوار کشت ہے سر سبز اور نیچی ہے باڑ

برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر ٹڈ یاں کب کی گئیں کھیتی کو چاٹ

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گئے کیا دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا

حالی نے اردو غزل کو تہذیب جذبات کے فن سے روشناس کرایا۔ تنگنا نے غزل کو وسعت بخشی۔ اس کو نئے مسائل اور نئے حالات سے روشناس کیا۔ جن مضامین کو شعراء نے بے حجابا نہ یا بے با کانہ بیان کر کے شرم وحیا کو طاق پر رکھ دیا حالی نے انھیں کو مہذب پیرایہ اور سیدھے سادے انداز میں بیان کیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

”حالی کی غزلوں میں جذبات کی جیسی شائستگی ،لہجہ کی نرمی، خیال کی بلندی،پاکیز گی، بیان کی سادگی اور فن کی پختگی ہے، اور شاعری و شرافت کا جیساامتزاج وتوازن ملتا ہے ۔ مجموعی طور پر کسی اور غزل گو کے یہاں مشکل سے نظر آئے گا۔۔۔ حالی غزل کے سارے لوازم برتتے ہیں، لیکن ان میں کسی کو اس کے حدود سے باہرنہیں نکلنے دیتے۔ “

چند اشعار:۔

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا سینے میں داغ ہے کہ مٹا یا نہ جائے گا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط الفت وہ راز ہے کہ چھپا یا نہ جائے گا

حالی اپنی شاعری سے اپنے معاشرے کے آدمی کو بدلنا چاہتے تھے۔ اس آدمی کو جو فرسودہ روایا ت اور اقدار کا پرستار تھا جو اس کے زوال کا باعث تھیں۔

ANS 02

حالی نے اردو غزل کو تہذیب جذبات کے فن سے روشناس کرایا۔ تنگنا نے غزل کو وسعت بخشی۔ اس کو نئے مسائل اور نئے حالات سے روشناس کیا۔ جن مضامین کو شعراء نے بے حجابا نہ یا بے با کانہ بیان کر کے شرم وحیا

کو طاق پر رکھ دیا حالی نے انھیں کو مہذب پیرایہ اور سیدھے سادے انداز میں بیان کیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

''حالی کی غزلوں میں جذبات کی جیسی شائستگی ،لہجہ کی نرمی، خیال کی بلندی،پاکیز گی، بیان کی سادگی اور فن کی پختگی ہے، اور شاعری و شرافت کا جیساامتزاج وتوازن ملتا ہے ۔ مجموعی طور پر کسی اور غزل گو کے یہاں مشکل سے نظر آئے گا۔۔۔ حالی غزل کے سارے لوازم برتتے ہیں، لیکن ان میں کسی کو اس کے حدود سے باہرنہیں نکلنے دیتے۔ ''

(رشید احمد صدیقی۔ جدید غزل ، ص۔ ۵۸۔۵۹)

چند اشعار:۔

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا سینے میں داغ ہے کہ مٹا یا نہ جائے گا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط الفت وہ راز ہے کہ چھپا یا نہ جائے گا

حالی اپنی شاعری سے اپنے معاشرے کے آدمی کو بدلنا چاہتے تھے۔ اس آدمی کو جو فرسودہ روایا ت اور اقدار کا پرستار تھا جو اس کے زوال کا باعث تھیں۔

خود بڑا بن کر دکھاؤ آپ کو باپ دادا کی بڑائی ہو چکی

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

جانور، آدمی ،فرشتہ، خدا آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں

حالی نے اردو غزل کو سچ بولنا سکھا یا وہ اپنی غزلوں میں اپنے جذبات کو ایک توازن کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے لہجے میں ایک ضبط اور ٹھہراؤ کا احساس ہو تا ہے ۔ درد مندی اور سوز و گداز ان کی غزلوں کا طرہ امتیاز ہے۔

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح کچھ ہم سے بھی سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں تھا حوصلہ اسی کا کہ اتنا صبور تھا

رنج اور رنج بھی تنہائی کا وقت پہو نچا مری رسوائی کا

غم دل نے رسوا کیا ہم کو آخر بنائی بہت شادمانی کی صورت

سمجھ کر کرو قتل حالی کو دیکھو مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

حالی کی غزل کی ایک اور خصوصیت مسلسل گوئی ہے۔ وہ جب کسی موضوع کو غزل میں بیان کرتے ہیں تو اس موضوع کے مختلف پہلوان کے سامنے رہتے ہیں ، جنھیں وہ اپنی غزل میں لاتے ہیں اور یہی تسلسل کا سبب

بنتے ہیں۔ اس طرح کی غزلوں میں جہاں انھوں نے حسن و عشق کی واردات پیش کی ہیں وہیں قومی اور ملکی مسائل کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ ایسی ہی ایک غزل حالی نے دہلی کی تباہی پر کہی ہے۔

جتنے رمنے تھے تیر ے ہوگئے ویراں اے عشق آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہر گز
کو چ کر گئے دلی سے ترے قدر شناس قدر یاں رہ کر اب اپنی نہ گنوانا ہر گز

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہر گز اسی غزل میں اپنے اساتذہ اور معاصرین کو یوں یاد کرتے ہیں۔

غالب و شیفتہ ونیروآزردہ و ذوق اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہر گز
مومن و علوی و صہبائی وممنون کے بعد شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہر گز
کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو ورنہ یہاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہر گز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہر گز

حالی زندگی کے مسائل اور عشق کے فلسفے کو نہایت ہی سادگی اور عام انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ انتہائی سنجیدہ مسائل کو سہل ممتنع بنا دیتے ہیں۔

وہ امید کیا جس کی ہو انتہا وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے
رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ زندگی موت ہے حیات نہیں
جلتے ہیں جبر ئیل کے شہپر جہاں بے پر وں کی وہاں رسائی ہوچکی

حالی کی غزلوں میں طنز و مزاح کے عناصر بھی ہیں۔ وہ ریاکار زاہدوں اور بے عمل خطیبوں اور واعظوں پر طنز کرتے ہیں۔

مان لیجئے شیخ جو دعوے کرے اک بزرگ دیں کو ہم جھٹلا ئیں کیا
اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار اک بزرگ آتے ہیں مسجدمیں خضر کی صورت

حالی کے یہاں پوری غزلیں اے شیخ، اے واعظ اور اے زاہد کے نام سے موجود ہیں:

کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاہد تیرا قبلہ ہے جدا میرا جدا اے زاہد
میں تو سوبار ملوں دل نہیں ملتا تم سے تو ہی کہہ اس میں ہے کیا، مری خطا اے زاہد
ریا کو صدق سے ہے جام مئے بدل دیتا تمھیں بھی ہے کوئی یاد ایسی کیمیا اے شیخ
غرور فقر غرور غنا میں فرق ہے کیا تجھی پہ رکھتے ہیں ہم منحصر بتا اے شیخ

حالی ؔ نے اپنی غزلوں میں ایسے الفاظ بھی استعمال کے جو غزل کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں سمجھے جاتے تھے۔علاوہ ازیں ہندوستانی تلمیحات اور ہندی الفاظ کے ساتھ ساتھ بول چال کے ٹھیٹ الفاظ اور محاورات نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کر کے غزل کے دامن کو وسعت بخشی ۔

ANS 03

اردو ڈراما کی تاریخ میں امتیاز علی تاج کی تخلیق ڈراما "انار کلی کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ اپنی مثال آ پ ہے ۔یہ ڈراما پہلی بار 1932میں شائع ہوا۔اس کے بعد اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اس ڈرامے کی مقبولیت بر قرار ہے ۔بھارت میں انارکلی کی کہانی کی اساس پر ایک فلم" مغل اعظم " بنائی گئی جسے فلم بینوں نے بہت پسند کیا ۔اپنی نوعیت کے لحاظ سے انارکلی ایک ایسی رومانی داستان ہے جس کے حقیقی مآخذ کے بارے میں اب تک کوئی ٹھوس تاریخی حقیقت یا دستاویزی ثبوت سامنے نہیں آیا۔خرافات،مفروضات،قیاس اور وہم و گمان کا ایک ایسا سلسلہ ہے جس نے تحقیقی منظر نامے کو گہنا دیا ہے ۔ادب کے قارئین اس داستان کے سحر میں اس قدر کھو گئے ہیں کہ حقائق کی تلاش میں پیہم ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں مگر نشان منزل کہیں نہیں ملتا۔وہی نور جہاں اور جہانگیر کے کبوتروں والا معاملہ ہے جو کبھی تھا ہی نہیں مگر آب حیات کا مطالعہ کرنے والے لوگ اب تک اسے کالنقش فی الجر قرار دیتے ہیں۔انار کلی کی پوری داستا ن ایسے واقعات سے لبریز ہے جو سرے سے کبھی وجود میں ہی نہیں آئے۔سرابو ں کی جستجو میں سرگرداں اور تحقیق سے گریزاں لوگوں کا یہ المیہ یہ ہے کہ وہ آئین نو سے خوف زدہ ہیں اور طرز کہن کی تقلید میں ان کی دلچسپی روز افزوں ہے ۔

ڈراما انارکلی ایک رومانی موضوع پر لکھی گئی داستان کی اساس پر استوار ہے ۔مطلق العنان مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر اپنی منظور نظر کنیز انار کلی کے حسن و جمال اور رقص کا شیدائی ہے ۔نادرہ نامی یہ کنیز قصر شاہی میں اس قدر دخیل ہے کہ تما م امور میں بادشاہ اس کی رائے کو اہمیت دیتا ہے ۔اس کنیز سے بادشاہ نے جو پیمان وفا باندھا وہ اس کی زندگی میں بے حد اہم ہے ۔اس کہانی میں ایک اہم موڑ اس وقت آتا ہے جب بادشاہ کا بیٹا اور ولی عہد شہزادہ سلیم بھی اسی کنیز کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو جاتا ہے جو اس کے باپ کے لیے راحت و آرام کا وسیلہ ہے ۔ ایک طرف تو جلال الدین اکبر کی ہیبت و سطوت کے سامنے یہ کنیز بے بس ہے تو دوسری طرف شہزادہ سلیم کی پر کشش شخصیت او رانداز دلر بائی نے اسے تذبذب میں مبتلا کر دیا ہے ۔اس کے لیے جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ بن جاتا ہے ۔ایک طرف تو شہنشاہ جلال الدین اکبر اس کنیز کو اپنی ذاتی ملازمہ سمجھتے ہوئے اس پر بلا شرکت غیرے اپنا استحقاق جتاتا ہے تو دوسری طرف ولی عہد شہزادہ سلیم کی نگاہ انتخاب اس پر پڑ چکی ہے اور اس کہ اپنی شریک حیات بنانے پر تل گیا ہے ۔انارکلی نہایت راز داری سے کام لیتے ہوئے اپنے دونوں عشاق کے دل کی تسکین کا خیال رکھتی ہے ،لیکن عشق اور مشک کبھی چھپائے نہیں چھپ سکتے ۔یہ راز بالآخر ایک اور کنیز دلآرام کی سازش سے طشت از بام ہو جاتا ہے دلآرام جو شہزادہ سلیم سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے ،جب اسے قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا گیا تو وہ رقابت کی آگ میں جلنے لگی اور اس نے انار کلی اور شہزادہ سلیم سے بدلہ لینے کی ٹھان لی ۔جلال الدین اکبر اور شہزادہ سلیم میں اس کنیزانار کلی کے حصول کے لیے محاذ آرائی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ دونوں کی افواج آمنے سامنے ہو جاتی ہیں اور ایک جنگ کے بعد شہزادہ سلیم اور انار کلی کو قید کر لیا جاتا ہے ۔شہزادہ سلیم تو محفوظ رہتا ہے مگر انار کلی کو جلال الدین اکبر کے احکامات کے تحت زندہ دیوار میں چنوا دیا

جاتا ہے ۔اس طرح اس پوری کہانی کو ایک المیہ قرار دیا جا سکتا ہے جس نے ایک پورے خاندان اور پوری سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا ۔جنرل مان سنگھ جیسے دلیر سپہ سالار اور معاملہ فہم سپاہی،اکبر جیسے سیاست دان اور منتظم کو اس رومانی داستان نے بے بس و لاچار بنا کر اضطراب میں مبتلا کر دیا ۔یہ تمام سوالات ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے لمحہ ءفکریہ ہیں۔وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ زیب داستاں کے لیے اس داستاں میں بات کا بتنگڑ بنا دیا گیا ہے ۔یہ سار ا افسانہ کذب و افترا ،بہتان طرازی ،الزام تراشی ،کردار کشی اور بدنیتی پر مبنی شقاوت آمیز نا انصافی کی قبیح مثال ہے ۔خود امتیاز علی تاج نے اس ڈرامے کی حقیقت کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے اور اس کو تاریخی واقعات سے متصادم سمجھتے ہوئے اس کی افسانوی حیثیت کو واضح کیا ہے ۔اس سے یہ حقیقت معلو م ہوتی ہے کہ افسانے کبھی حقیقت نہیں بن سکتے ۔اس فرضی ،من گھڑت اور پشتارہءکذب و افترا ڈرامے کے پس منظر کے بارے میں کچھ چشم کشا حقائق پیش خدمت ہیں۔ان کی روشنی میں تا ریخی صداقتوں کی تفہیم اور درست نتائج تک رسائی کی ایک ممکنہ صورت پید ا ہو سکتی ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ انار کلی کا واقعہ 1599میں وقو ع پذیر ہوا ۔یورپی سیاح ولیم فنچ جو 1618میں لاہور پہنچا،اس نے اپنی یاد داشتوں میں اس المیے کا ذکر بڑے دردناک انداز میں کیا ہے ۔اس نے پوری کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح اس من گھڑت واقعے کے ذریعے مغل شہنشاہ اکبر کو بد نام کیا جائے ۔اس نے اکبر کی توہین ،تذلیل ،تضحیک اور بے توقیری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔انگریزوں کا یہ وتیرہ ہے کہ وہ مشرقی تہذیب و تمدن کی رسوائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔اس کے بعد 1618میں ایک اور یورپی سیاح ایڈورڈ ٹیری لاہور آیا ،اس نے بھی اپنے پیش رو سیاح ولیم فنچ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اس فرضی داستان کو خوب نمک مرچ لگا کر پیش کیا۔دراصل یہ ایک سازش تھی جسے مسلسل آگے بڑھایا جا رہا تھا ۔چار سال بعد یعنی 1622میں یورپ سے سیاحت کی غرض سے آنے والے ایک اور سیاح ہربرٹ نے بھی اس قصے کو اپنی چرب زبانی سے خوب بڑھا چڑھا کر بیا ن کیا ۔اس کے باوجود کسی نے ان بے سروپا الزامات اور ہف وات پر کان نہ دھر ا ۔اس زمانے میں ادب کے سنجیدہ قارئین نے اس قسم کے عامیانہ نوعیت کے بیانات کو کبھی لائق اعتنا نہ سمجھا۔ پورے دو سو سال تک بر صغیر کے لوگ اس قصے سے لا علم رہے کسی غیر جانب دار مورخ کے ہاں اس کا ذکر نہیں ملتا ۔نور الدین جہانگیر نے تزک جہانگیری میں کہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔اس عہد کے ممتاز مورخ والہ داغستانی اور خافی خان جو اکبر اور جہانگیر کی معمولی نوعیت کی لغزشوںپر بھی نظر رکھتے تھے ،انھوں نے بھی کسی مقام پر اس قصے کو ذکر نہیں کیا۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام قصہ محض تخیل کی شادابی ہے ۔یورپی سیاحوں نے اپنی منفی سوچ کو بروئے کا لاتے ہوئے سازش کا جو بیج بویاوہ رفتہ رفتہ نمو پاتا رہا ۔1864میں مولوی نور احمد چشتی نے اپنی تصنیف " تحقیقات چشتی " میں انار کلی اور اکبر کے اس رومان کا ذکر کیا ہے ۔1882میں کنہیا لال ہندی نے اپنی تصنیف "تاریخ لاہور " میں انار کلی ،اکبر اور سلیم کے اس المیہ قصے کا احوال بیان کیا ہے ۔یہ سلسلہ مقامی ادیبوں کے ہاں ایک طویل عرصے کے بعداس قصے کی باز گشت سنائی دینے لگی ۔سید محمد لطیف نے بہت بعد میں انار کلی اور

اکبر کے اس المیے کا ذکر اپنی تصنیف (History of Lahore)میں کیا ہے ۔یہ انگریزی کتاب 1892میں شائع ہوئی۔تاریخ حقائق سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انار کلی ،اکبراور سلیم کا یہ رومانی المیہ جسے ابتدا مینیورپی سیاحوں نے محض تفنن طبع کے لیے اختراع کیا ،آنے والے دور میں اس پر لوگوں نے اندھا اعتماد کرنا شروع کر دیا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت کو خرافات کے سرابوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے ۔دروغ گوئی کے اس طوفان بلا خیز میں بسیط حقائق اب عنقا ہوتے چلے جا رہے ہیں ۔اس لرزہ خیز اعصاب شکن حالات میں ادبی تحقیق پر مائل ادیب یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ دیکھیے اب خفاش ، افسانہ طراز ،چربہ ساز او رکفن دزد عناصر کیا گل کھلاتے ہیں اور نتائج کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے ۔یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے ہانتحقیق کی روشنی میں موضوعات کو جانچنے کی روایت اب توجہ طلب ہے ۔

خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھیے

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

آثار قدیمہ،تاریخی حقائق اور دستاویزی ثبوت اس تمام المیہ ڈرامے کو جھوٹ کا پلند قرار دیتے ہیں ۔وہ دیوار جس کے بارے میں یہ شوشہ چھوڑا گیا کہ اس میں انار کلی کو زندہ دفن کیا گیا ۔اس کے آثار لاہور شہر

میں کہیں موجود نہیں ۔انار کلی کے تنازع پر جنرل مان سنگھ اور شہزادہ سلیم کی مسلح افواج کے درمیان جو خونریز جنگ ہوئی اس کے میدان جنگ ،مرنے والوں اور زخمیوں کی تعداد کا کوئی علم نہیں۔یہ بھی معلوم نہیں کہ شہزادہ سلیم اپنے ساتھ جو لشکر جرار لایا اس کی فوری بھرتی کیسے ممکن ہو سکی ۔جنرل مان سنگھ تو مغل افواج کی کمان کر رہا تھا شہزادہ سلیم نے ایک بڑی فوج کہاں سے حاصل کی او راس کی تنخواہ اور قیام و طعام کا بندوبست کیسے ہوا ؟جنرل مان سنگھ کی کامیابی کے بعد شہزادہ سلیم کی حامی اور اکبر کی مخالف فوج پرکیا گزری؟کیا اکبر کی سراغ رسانی اس قدر کم زور تھی کہ اسے دلآرام کے علاوہ کسی سراغ رساں نے اس بات کی مخبری نہ کی کہ ولی عہد شہزادہ ایک کنیز کے چنگل میں پھنس کر بغاوت پرآماد ہ ہو سکتا ہے ۔کیا اکبر اعظم کا نظا م سلطنت اس قدر کم زور تھا کہ اسے اپنے خلاف سازش اور بغاوت کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔یہ سب سوال ایسے ہیں جو اس قصے کو نہ صرف من گھڑت ثابت کرتے ہیں بلکہ اسے یورپی سیاحوں کی بد نیتی اور ذہنی افلاس پر مبنی ایک صریح جھوٹ قرا ردیتے ہیں ۔

لاہورسول سیکرٹیریٹ مینجو انارکلی کے نام سے موسوم ہے وہ انار کلی کا مقبرہ نہیں بلکہ زین خان کوکہ کی صاحب ذادی "صاحب جمال "کی آخری آرام گاہ ہے۔ یہ شہزادہ سلیم کی منکوحہ تھی ۔ اس کا مقبرہ شہزادہ سلیم نے اپنے عہد میں تعمیر کروایا ۔امتیاز علی تاج نے ولیم فنچ کے بیان کو بنیاد بنا یا ہے ۔ یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ اور تخلیق ادب کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں ۔ فرد کی اجتماعی زندگی مختلف نوعیت کے حالات کی امین ہوتی ہے ۔ زندگی میں تغیر و تبدل کا ایک نظام موجود ہے اور اجتماعی زندگی انہی قوانین کے زیر اثر رہتی ہے ۔وادی ءخیال کو مستانہ وار طے کرنے والوں کہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے کہ شعور و ذہن کا ارتقاتاریخ کے ایک

ایسے مسلسل عمل کی جانب متوجہ کرتا ہے جو فکر و نظر کے متعدد نئے دریچے وا کرنے کا مؤثر ترین وسیلہ ہے ۔سید امتیاز علی تاج نے تاریخ او ر تاریخ کے مسلسل عمل کے بارے میں بلاشبہ مثبت شعور و آگہی پروان چڑھانے کی سعی کی ہے ۔ان کے اسلوب میں تاریخی شعور کا جو منفرد انداز جلوہ گر ہے وہ زندگی کی ایسی معنویت کا مظہر ہے جو نئی بصیرتوں کی امین ہے ۔ہیگل نے لکھا ہے۔

"چونکہ انسانی آزادی اور حساس آزادی ایک چیز ہے لہذا آزادی کا ارتقا کا شعور ذہن کا ارتقا ہے۔ اس عمل میں ہر قسم کے افکار تشکیل پاتے ہیں ۔ اس لیے فلسفہ تاریخ صرف انسانی عمل ہی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ وہ کائناتی عمل سے بھی پردہ اٹھاتا ہے۔"(1)

تاریخ کا ایک مسلسل عمل ہو ا کرتا ہے یہ ڈراما اسی جانب توجہ مبذول کراتا ہے کہ سیل زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر ہے اس کے بعد تخت و کلاہ و تاج کے سب سلسلے نیست و نابود ہو جاتے ہیں ۔سکندر ،دارا اور اکبر سب تاریخ کے طوماروں میں دب جاتے ہیں ۔اور ان کے نام پر ابلق ایام کے سموں کی گرد پڑ جاتی ہے اور سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے ۔

ڈرامہ انارکلی امتیاز علی تاج نے 1922میں مکمل کیا۔ اس کی اشاعت دس سال بعد ہوئی۔اس ڈرامے کو تاریخ کا معتبر حوالہ قرار نہیں دیا جاسکتا ۔ اس ڈرامے کے اہم پہلو حسب ذیل ہیں:

پلاٹ

سید امتیاز علی تاج کو زبان و بیان پر خلاقانہ دستر س حاصل تھی ۔ ڈراما انارکلی کا پلاٹ سادہ اور مؤثر ہے۔ تخلیقی عمل میں ذہن و ذکاوت کو بروئے کار لاتے ہوئے امتیاز علی تاج نے نہ صرف کہانی کا تسلسل برقرار رکھا ہے بلکہ پلاٹ کی ضروریات کے مطابق کشمکش، حیرت و استعجاب اور جستجو کا بھی خیا ل رکھا ہے ۔قاری ہر لمحہ اس فکر میں رہتا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے ۔ امتیاز علی تاج کو مورخ سمجھناایک غلطی ہوگی۔ایک ڈراما نگار اور فکشن رائٹر سے تاریخی حقائق کی چھان پھٹک اور سچے واقعات کی تحقیق کی توقع رکھنا نہ صرف نا مناسب ہے بلکہ ادبی اسلوب کے تقاضوں کے بھی خلاف ہے ۔وہ ایک صاحب طرز نثر نگار تھے ۔انھوں نے اپنے منفرد اسلوب کے اعجاز سے ڈراما انار کلی میں جس طرح تخیل کی جولانیا ں دکھائی ہیں وہ اس ڈرامے کو لا زوال بنا چکی ہیں ۔اگرچہ ڈراما انار کلی کا پلاٹ تاریخی صداقتوں سے معرا ہے مگر اسلوبیاتی حوالے سے یہ پلاٹ اس قدر پر تاثیر اور جان دار ہے کہ قاری اس کی گرفت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا ۔

مکالمہ نگاری

ڈراما انار کلی کے مکالمے پتھروں سے بھی اپنی تاثیر منوالیتے ہیں۔مثلاً اکبر کا یہ کہنا " آہ ! میرے خواب ۔ وہ ایک عورت کے عشووں سے بھی ارزاں تھے ۔ فاتح ہند کی قسمت میں ایک کنیز سے شکست کھانا لکھا تھا ۔"

مکالموں میں جذبات کا ایک سیل رواں ہے جو امڈا چلا آتا ہے ۔ قاری اس سیل رواں میں بہتا چلا جاتا ہے ۔ کرداروں کا دبنگ لہجہ بادل کی طرح کڑکتا ہے اور بجلی کی طرح چمک کر نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے ۔کرداروں کی خود

کلامی قاری کو مسحورکردیتی ہے ۔یہ خود کلامی داخلی کرب اور جذباتی شکست و ریخت کا پورا احوال سامنے لاتی ہے ۔ مثلاً:

انارکلی : " میری ا ماں ! میں خوش ہونے والاسے دل کہاں سے لاؤں ؟ تمھیں کیسے سمجھاؤں کہ میں کیوں غمگین ہوں؟"

سلیم : سب کچھ ہو چکا ، انھیں سب معلوم ہوگیا ۔ محبت بچھڑ گئی ، آرزوئیں اجڑ گئیں"

انارکلی کی ایک اور خود کلامی قابل توجہ ہے،اس میں وہ اپنے گلے میں اپنی ہی باہیں ڈال کر مرگ آرزو کا ماتم کرتی نظر آتی ہے ۔اس کا پورا وجود کرچیوں میں بٹ جاتا ہے اور تڑپ کر پکار اٹھتی ہے :

"ٹوٹ جا۔ نیند ٹوٹ جا ، میں تھک گئی ، سانس ختم ہو جائیں گے"

اکبر کی خود کلامی میں اندیشہ ہائے دور دازاور مستقبل کے حادثات اور تفکرات کے متعلق نہایت پر اسرار گفتگو ہے جو قاری کو حیرت زدہ کر دیتی ہے ۔سید امتیاز علی تاج نے اس قسم کی خود کلامی کے ذریعے اپنے اسلوب کی تاثیر کو دو آتشہ کر دیا ہے ۔قاری پہلے تو اس تما م کیفیت کو حیرت سے دیکھتا ہے س کے بعد وہ گہری سو چ :میں ڈوب جاتا ہے ۔سید امتیاز علی تاج نے اکبر کی خود کلامی کالفظی مرقع جس انداز پیش کیا ہے وہ اس بادشاہ کے اندرونی کرب اور ذہنی پریشانی کو صحیح کیفیت میں سمجھنے میں مدد دیتی ہے :

" میرے دماغ میں شعلے بھڑک رہے ہیں ۔میں نہیں سمجھتا کیا کر بیٹھوں گا،مگر وہ اس صدمے کی طرح مہیب ہو گا ۔"

سید امتیاز علی تاج کو نفسیاتی کیفیات اور قلبی احساسات کے بیان پر جو قدرت حاصل ہے وہ ان کے اسلوب کا نمایاں ترین وصف ہے ۔مثال کے طور پر خود کلامی کرنے والے کردار در اصل اپنے داخلی کرب اور اندرونی کش مکش کو اپنے مکالمات کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔شہزادہ سلیم کی خود کلامی سن کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شہزادہ کن اندیشوں کے نرغے میں ہے :

"کیسی گہری اور اندھیری کہر ،جس میں خون کے جلتے ہوئے دھبے ناچ رہے ہیں او راس پار زرد چہرہ،پھٹی ہوئی آنکھیں اور سلیم !سلیم !کی فریاد "

جس وقت انار کلی کو اکبر کے حکم کے تحت قلعہ لاہور کے زندان کے عقوبت خانے میں قید کیا جاتا ہے تو وہ بے بسی کے عالم میں سلیم کو پکارتی ہے ۔اس کی یہ دردناک آواز قاری کی روح پر گہرا اثر مرتب کرتی ہے ۔سید امتیاز علی تاج نے ان ہراساں شب و روز کا احوال بیان کرتے ہوئے تمام نفسیاتی پہلوؤں کہ پیش نظر رکھا ہے :

"آجاؤ!تمھاری انار کلی تمھیں دیکھے بغیر نہ گزر جائے "

سید امتیاز علی تاج نے ڈراما انار کلی مینمکالمہ نگاری کے فن کو اوج کمال تک پہنچا دیا ہے ۔تمام کردار موقع اور محل کی مناسبت سے جو گفتگو کرتے ہیں وہ نہ صرف ان کے حسب حال ہوتی ہے بلکہ اسے سن کر قاری کی آنکھیں بھی پر نم ہو جاتی ہیں۔سید امتیاز علی تاج نے فنی تجربوں کے اعجاز سے ڈراما نگاری کو نئے امکانات سے

آشنا کیا ۔کردار نگار ی اور مکالمہ نگاری میں انھوں نے جو منفرد تجربات کیے ہیں ان سے اردو ڈراما کی ثروت میں اضافہ ہوا ہے ۔ڈرامہ نگاری میں نت نئے تجربات ان کی ادبی زندگی کا عشق قرار دیئے جا سکتے ہیں۔انھوں نے ڈرامہ نگاری میں پائے جانے والے جمود اور یکسانیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا اور افکار تازہ کی ایسی شمع فروزاں کی جس کی ضیاپاشیوں سے جہان تازہ تک رسائی کے امکانات روشن تر ہوتے چلے گئے ۔

ANS 04

''خضر ِراہ'' علامّہ اقبال نے انجمن حمایت ِاسلام لاہور کے ۳۷ ویں سالانہ جلسے، منعقدہ ۱۶ اپریل ۱۹۲۲ئ، میں ترنم سے پڑ ھ کر سنائی ۔ یہ جلسہ اسلامیہ ہائی سکو ل شیراں والا گیٹ میں منعقد ہوا تھا۔ چودھری محمد علی بتاتے ہیں: '' جلسے سے چند روز قبل ان کی طبیعت ناساز تھی، مگر عین جلسے کے دن ان کی طبیعت سنبھل گئی۔ جلسے میں تشریف لائے۔ اگرچہ بوجہ نقاہت مسند پر بیٹھ کر نظم ' خضر راہ ' سنائی لیکن آواز میں وہی سوزر اور لہجے میں وہی تاثیر تھی''۔ (سیارہ : اقبال نمبر۱۹۶۳ئ: ص۳۰)

''خضرراہ'' کو اقبال نے نہایت دردر انگیز لَے میں پڑ ھا تھا۔ غلام رسول مہر کا بیان ہے کہ :'' یہ نظم سننے کے لیے بے شمار آدمی جمع ہو گئے تھے... پورا مجمع بیس ہزار سے کم نہ ہوگا۔ بعض اشعار پر اقبال خودبھی بے اختیار روئے اور مجمع بھی اشک بار ہو گیا۔ بیان کیا جاتاہے کہ اقبال پر جتنی رقت '' خضر راہ '' پڑ ھنے کے دوران میں طاری ہوئی ،اتنی کسی نظم کے دوران میں نہ ہوئی ''۔ (مطالب بانگِ درا: ص ۳۰۶) بعض دوسری نظمونکے برعکس '' خضرراہ''پہلے سے شائع نہیں کی گئی۔ اقبال کے پاس نظم کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا، تاہم نظم کا زیادہ ترحصہ انھوں نے حافظے کی مدد سے زبانی سنایا۔ نظم کی ابتدائی شکل میں چھٹے بند کا چوتھا شعر:

نوعِ انسانی کے لیے سب سے بڑی لعنت یہ ہے
شاہ راہِ فطرت اللہ میں یہ ہے غارت گری

بانگِ درا کی ترتیب کے وقت اقبال نے اس شعر کو نظم سے حذف کر دیا۔ ''صحرا نوردی'' کے تحت تیسرا شعر ، ابتدائی صورت میں یوں تھا:

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ گدائے بے برگ و ساماں ، وہ سفر بے سنگ و میل

''زندگی '' کے تحت آخری شعر(یہ گھڑی محشر کی ہے ...) '' خضر راہ'' کے ابتدائی متن میں موجود نہیں تھا۔یہ ایک اور نظم '' کلاہِ لالہ رنگ'' کاآخری شعر تھا۔ بعد میں نظم کو متروک قرار دے کر یہ شعر '' خضر راہ '' میں شامل کر دیا گیا۔

''خضرراہ'' اقبال نے ۱۹۲۲ء میں لکھی۔ اس زمانے میں دنیاے اسلام کی حالت بد سے بد تر ہو چکی تھی۔ جنگ ِعظیم دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے تباہی و مصیبت کا پیغام لائی تھی۔ سلطنت ِ عثمانیہ بکھر گئی تھی، عرب دنیا مختلف ٹکڑ وں میں بٹ چکی تھی، جن پر استعماری طاقتوں کے کٹھ پتلی شاہ حسین اور اس کے بیٹے دادِ حکمرانی

دے رہے تھے۔ اعلانِ بالفور (۱۹۱۷ئ) کے ذریعے برطانیہ نے یہودیوں کو فلسطین میں صہیونی ریاست کے قیام کے لیے بنیاد فراہم کر دی تھی۔ ترکی کا اندرونی خلفشار بڑ ھ گیا تھا۔ مصطفی کمال اور ان کے ساتھیوں نے انقرہ میں متوازی حکومت قائم کر لی تھی۔ برائے نام خلافت چند دنو ں کی مہمان نظر آتی تھی۔ بیرونی دباؤ بھی کم نہ تھا۔

ادھر ہندستان میں مسلمانوں کی حالت بہت قابلِ رحم تھی کیونکہ بہت سے لوگ تحریک ہجرت کی بے نظمی او رراہ نمائوں کی بے تدبیری کا نتیجہ بھگت رہے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ امرتسر کے الم ناک سانحے میں جنرل ڈائر کی وحشیانہ فائرنگ سے سیکڑوں افراد ہلاک ہو گئے اور پنجاب میں مارشل لا نافذ ہو ا، اس سے ہندستانیوں کی مشکلا ت میں اور اضافہ ہوا۔

فکری جائزہ

زیر مطالعہ نظم میں اقبال نے، مختلف مسائل اپنے خیالات کے اظہار کے لیے خضر کے روایتی کردار کا سہارا لیا ہے۔

*خضر کی شخصیت:

خضر کی شخصیت کے بارے میں تاریخی اور ادبی روایات معروف تو ہیں مگر مستند نہیں اور ان کی روشنی میں کسی واضح نتیجے تک پہنچنا ممکن نہیں۔ قرآن و حدیث میں خضر کا تذکرہ موجود ہے اور یہ ماخذ زیادہ یقینی ، مستند اور معتبر ہے۔

قرآن پاک کی سورۃ الکہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس واقعے کا تعلق اس دور سے ہے جب مصر میں بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم کا سلسلہ جاری تھا۔ قرآن پاک کے مطابق یہ واقعہ اس طرح ہے:

" (ذرا ان کو وہ قصہ سناؤ جو موسیٰ ؑ کو پیش آیا تھا)جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا تھاکہ"میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاوں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں، ورنہ میں ایک زمانۂ دراز تک چلتا ہی رہونگا"۔ پس جب وہ ان کے سنگم پر پہنچے[غالباً موسیٰ ؑ کا یہ سفر سوڈان کی جانب تھا اور مجمع البحرین سے مراد وہ مقام ہے جہاں موجودہ شہر خرطوم کے قریب دریاے نیل کی دو بڑی شاخیں البحرالابیض اور البحر الارزق آکر ملتی ہیں۔ سیدابوالاعلیٰ مودودیؒ: تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۳۵]تو اپنی مچھلی سے غافل ہو گئے اور وہ نکل کر اس طرح دریا میں چلی گئی جیسے کہ کوئی سرنگ لگی ہو۔ آگے جاکر موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا:" لاؤ ہمارا ناشتا، آج کے سفر میں تو ہم بری طرح تھک گئے ہیں"۔ خادم نے کہا: "آپ نے دیکھایہ کیا ہوا؟جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے، اس وقت مجھے مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کاذکر (آپ سے کرنا) بھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی"۔ موسیٰ نے کہا"اس کی تو ہمیں تلاش تھی"۔ چنانچہ وہ دونوں اپنے نقش قدم پر پھرواپس ہوئے اور وہاں انھوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا، جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا۔

" موسیٰ نے اس سے کہا:" کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اس دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے؟" اس نے جواب دیا:" آپ میرے ساتھ صبر نہیں کرسکتے اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو، آخر آپ اس پر صبر کربھی کیسے سکتے ہیں۔" موسیٰ نے کہا:" ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملے میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔ " اس نے کہا:" اچھا ، اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں، جب تک کہ میں خود اس کا آپ سے ذکر نہ کروں"۔

اب وہ دونوں روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ ایک کشتی میں سوار ہوگئے تو اس شخص نے کشتی میں شگاف ڈال دیا۔ موسیٰ نے کہا :"آپ نے اس میں شگاف ڈال دیا تاکہ سب کشتی والوں کو ڈبودیں؟ یہ تو آپ نے ایک سخت حرکت کر ڈالی"۔ اس نے کہا:" میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے "؟ موسیٰ نے کہا:"بھول چوک پر مجھے نہ پکڑیے ، میرے معاملے میں آپ ذرا سختی سے کام نہ لیں"۔

ANS 05

زندگی

برتر از اندیشۂ سُود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم‌دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زِندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے، ضمیر کُن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پُوچھ
جُوئے شِیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھَٹ کے رہ جاتی ہے اک جُوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قُوّتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹّی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹّی کا اک انبار تُو
ُختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تُو

پہلا ہی مصرعہ منظر کی ایک مکمل تصویر صرف تین پیکروں میں کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ پہلے پیکر میں شب سکوت افزا ہے، دوسرے میں اس سکوت افزائی کا اثر فضا پر یہ ہے کہ ہوا آسودہ ہے اور تیسرے میں سطح پر اثر یہ ہے کہ دریا نرم سیر ہے، ہوا کے لیے الف کا استعمال تین بار ہوا ہے جس میں دو بار لگاتار ممدودہ کی شکل میں اور پانی کے لیے رکا استعمال بھی تین بار ہوا ہے فضا کے کامل سکوت اور سطح کی پر سکون روانی کے لیے ان حروف کا استعمال موزوں ترین ہے، یہ تینوں پیکر ایک لفظ، سکوت افزا کا فیض ہے۔ شاعر نے رات کو محض ساکت نہیں کہا سکوت افزا کہا ہے یعنی وہ پرسکوت ہونے کے ساتھ ساتھ سکوت انگیز بھی ہے۔ اس طرح صرف آٹھ لفظوں میں رات کے سکوت کی موثر ترین تصویر کشی کے بعد دوسرے مصرعے میں منظر کو تصویر آب سے تشبیہہ اس تمہید کے ساتھ دی جاتی ہے کہ نظر حیراں تھی نظر کی حیرانی تو مشاہدہ کا رد عمل ہے جبکہ منظر کا مشاہدہ صرف تصویر آب کی نشاندہی کرتا ہے۔ بس ایک مختصر سی فقط دو لفظوں کی بالکل سادہ ترکیب مصرع اول کی تصویر پر ایسا پر اثر حکم لگاتی ہے کہ خود تصویر کے اندر اس کی تکمیل ہونے کے باوجود ایک اضافہ سا ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ تشبیہہ کا بہترین مصرف ہے، بعد کا شعر " تصویر آب" کی ایک تفصیل ہے اور اس کے بعد کا شعر سکوت افزا کی تفصیل۔ ان تفصیلات سے اس مکمل تصویر میں تو فی الواقع اضافہ نہیں ہوتاجو زیر بحث شعر میں کھینچی گئی ہے۔ مگر اس تصویر کے اثرات میں ضرور توسیع ہوتی ہے۔

بہرحال، منظر فطرت کا یہ طلسم پانچویں ہی شعر میں ٹوٹ جاتا ہے اور نہایت ڈرامائی گرچہ تمہید کے مفہوم کے لحاظ سے متوقع طور پر خواجہ خضر کی شخصیت منظرپر ابھرتی اور جزو منظر بن جاتی ہے:

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویاے اسرار ازل
چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

خضر کی شخصیت کا خاکہ صرف دو پیکروں پر مشتمل ایک ہی شعر میں مرتب ہو جاتا ہے پہلے مصرعے میں ان کو" پیک جہاں پیما" کہا گیا ہے اور دوسرے میں ان کے متعلق بیان ہے کہ " جس کی پیری میں مانند سحر رنگ شباب" یہ دونوں پیکر خضر کی کردار نگاری کے لیے تقریباً کافی ہیں چونکہ وہ جہاں گرد مشہور ہیں لہٰذا انہیں " پیک جہاں پیما" کہا گیا اور چونکہ ان کے بارے میں غیر معمولی طول عمر کی روایت مروج ہے لہٰذا ان کی پیری میں مانند سحر رنگ شباب کا بیان دیا گیا، یعنی جس طرح صدیوں سے ایک ہی طرح بہر روز طلوع ہونے کے باوجود تازگی و شادابی کا وہ مظہر ہے جسے شباب کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے، اسی طرح خضر بھی صدیوں پر محیط طول عمر کے باوجود جوانوں کی طرح چستی و مستعدی سے پیہم جہاں گردی کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد کا شعر مکالمے کا آغاز ہے، جو خضر کی طرف سے ہوتا ہے۔ ایک مصرعے میں خضر کا پہلا ہی بیان ان کے کردار او رشخصیت کا ایک اور گوشہ ہماری نگاہوں کے سامنے لے آتا ہے۔ قبل کے پیکروں میں جو شاعر کے بیان پر

مشتمل تھے، خضر کی ظاہری شخصیت کا خاکہ کھینچا گیا تھا، لیکن اب ان کا صرف ایک ملفوظ ان کے کردار کی باطنی حقیقت کو آشکار کر دیتا ہے:

چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

خود خضر کی نگاہوں پر مروجہ روایات کے لحاظ سے، تقدیر عالم بے حجاب ہے اور وہ اس بصیرت کا یہ نسخہ شاعر کو بتاتے ہیں کہ چشم دل وا ہو یعنی انسان کی روح اپنی تمام گہرائیوں کے ساتھ بیدار ہو جائے تو دل کے اندر وہ روشنی پیدا ہو جاتی ہے جو مظاہر حیات اور واقعات عالم کے پیچھے مضمر حقائق کے مشاہدے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ خضر کا یہ قول جس طرح ان کے کردار کے مطابق ہے اسی طرح شاعر کی متجسس طبیعت کے تقاضے کا جواب ہے۔ چنانچہ وہ اقرار کرتا ہے:

دل میں یہ سن کر بپا ہنگامہ محشر ہوا

میں شہید جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

شاعر کا یہ بیان اس کی کردار نگاری بھی اس کی ہی زبان سے کرتا ہے اور نظم کے موضوع و مقصد کے اظہار کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔